سورۃ البقرۃ (۱۹)

(آیات : ۲۶- ۲۷)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۱۹ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا
مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ
اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا
وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ

© rasailojaraid.com

.com

إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

۲:۱۹:۱ اللغۃ

[اِنَّ اللّٰہَ] اِنَّ (بے شک، یقیناً) + اللہ (تعالیٰ) ۔ اسمِ جلالت (اللہ) کے مادہ و اشتقاق کی بحث "بسم اللہ" میں گزر چکی ہے یعنی ۱:۱:۱ (۲) میں

۲:۱۹:۱(۱) [لَا یَسْتَحْیٖ] میں "لَا" تو نفی ("نہیں" کے معنی پیدا کرنے) کے لیے ہے۔ "یَسْتَحْیٖ" کا مادہ "ح ی ی" اور وزنِ اصلی "یَسْتَفْعِلُ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "یَسْتَحْیِيُ" تھی جس میں پہلے تو فعل ناقص کے صیغۂ مضارع کی آخری مضموم "ی" کو ماقبل مکسور کی وجہ سے ساکن کر دیا جاتا ہے (جیسے یَرْمِيُ سے یَرْمِیْ اور یَقْضِيُ سے یَقْضِیْ ہو جاتا ہے)۔ اس طرح اس فعل مضارع کے آخر پر ایک یائے مکسورہ اور اس کے بعد ایک یائے ساکنہ ہے۔ جسے "یِیْ" کی شکل میں لکھا جانا چاہیے تھا (یعنی بصورت "یَسْتَحْیِیْ") مگر قرآن کریم میں اسے صرف ایک "یاء" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ پھر ضبط کے ذریعے اس محذوف "ی" کو ظاہر کیا جاتا ہے (یعنی اس محذوف کو پڑھا ضرور جاتا ہے)۔ اس پر مزید بحث "الرسم" اور "الضبط" کے عنوان کے تحت ہو گی

● اس مادہ (ح ی ی) سے فعل ثلاثی مجرد "حَیَّ یَحْیٰی حَیَاۃً" (باب سمع سے) آتا ہے اور جو دراصل حَیِیَ یَحْیَیُ تھا پھر اس سے (۱) حَیِیَ

d.com

یَحْییٰ بنا۔ جس میں ادغام ("ی" کے دو دفعہ۔ مضاعف۔ ہونے کی وجہ سے) کرکے (۲) "حَیَّ یَحَیُّ" "مَسَّ یَمَسُّ کی طرح) بھی استعمال کرتے ہیں اور صرف ماضی ادغام کے ساتھ اور مضارع بغیر ادغام کے بھی استعمال کرتے ہیں یعنی (۳) "حَیَّ یَحْییٰ" بولتے ہیں۔ اور قرآن کریم میں یہی آخری (تیسری) صورت (حَیَّ یَحْییٰ) استعمال ہوئی ہے (الانفال : ۴۲)۔ بعض قبائل عرب صیغۂ ماضی کو حَیِیَ (بروزن خَشِیَ و رَضِیَ) ہی استعمال کرتے ہیں اور ان تینوں صورتوں میں اس فعل مجرد کے معنی ہیں "زندگی پانا، زندہ ہونا، جاندار ہونا، حیات (زندگی) والا ہونا"۔۔۔ عربی زبان میں حَیِیَ یَحْییٰ حَیَاءً "شرمانا، حیا کرنا کے معنی میں بھی آتا ہے مگر ان معنی کے لیے یہ فعل (ثلاثی مجرد) قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوا۔ (مزید فیہ سے یہ معنی آئے ہیں جن پر ابھی بات ہوگی)۔۔۔ اس فعل (ثلاثی مجرد) سے ماضی کا صیغۂ تثنیہ "حَیَیَا" ہوگا اور صیغہ جمع مذکر غائب "حَیُّوا" کے علاوہ "حَیُوْا" (یاء کی تخفیف کے ساتھ رَضُوْا اور خَشُوْا کی طرح) بھی استعمال کیا جاتا ہے۔۔۔ قرآن کریم میں اس مادہ (ح ی ی) سے فعل مجرد کے مختلف صیغے سات جگہ آئے ہیں، اس کے علاوہ مزید فیہ کے بعض ابواب (افعال، تفعیل اور استفعال) سے مختلف صیغے ۶۳ جگہ اور اس مادہ سے متعدد اسماء مشتقہ اور مصادر وغیرہ سو سے زائد مقامات پر آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ فعل "یستحی" اس مادہ سے باب استفعال کے فعل مضارع کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اِسْتَحْیٰ ... یَسْتَحْیِیْ اِسْتِحْیَاءً" کے تین معنی ہیں: (۱) ..... سے شرمانا ..... سے جھینپنا، ..... سے عار کرنا (یعنی نفس کا کسی کام کی برائی کی وجہ سے اس کے کرنے میں گھٹن محسوس کرنا) (۲) ..... کو زندہ بچا لینا، اور اسی سے تیسرے معنی پیدا ہوتے ہیں یعنی ..... کو باقی چھوڑنا یا چھوڑ دینا۔

پہلے معنی کے لیے اس کا مفعول بنفسہ بھی آتا ہے اور "مِنْ" کے صلہ کے ساتھ بھی۔ مثلاً کہتے ہیں: استحیاہ اور استحیی منہ (وہ اس سے

© rasailojaraid.com

شرمایا) ۔اور کبھی " من " کی بجائے " أَنْ " لگاکر ساتھ فعل مضارع کا ایک صیغہ لاتے ہیں مثلاً کہیں گے : "یَسْتَحْیِیْ أَن .... " = وہ اس بات سے شرماتا ہے کہ ......)۔ جیسے یہاں آیت زیرِ مطالعہ میں " لا یستحیی أن یضربَ ....." آیا ہے ۔یہاں بھی دراصل " أن " سے پہلے ایک " مِن " محذوف سمجھا جاتا ہے یعنی "......مِنْ أن یضربَ ....." ہے

دوسرے معنی کے لیے کوئی صلہ استعمال نہیں ہوتا بلکہ مفعول بنفسہٖ آتا ہے مثلاً استحیاہ = اسے زندہ بچالیا ، رہنے دیا ۔ یہ استعمال بھی قرآن کریم میں آگے آئے گا ۔

● بعض قبائل عرب (مثلاً بنو تمیم) اس فعل کو " استحٰی یستحِی " یعنی صرف ایک " یاء " (ی) سے بولتے ہیں مگر اہلِ حجاز کی بولی "استحیٰی یَسْتَحْیِیْ " یعنی دو " یاء " کے ساتھ ہے ۔اور یہی بولی قرآن کریم میں آئی ہے ۔ (بلحاظ " رسم " ایک "یاء " سے لکھا جانا اور بات ہے تلفظ میں دو " یاء " ہی آتی ہیں) —— اور یہ دو یاء والا استعمال اس لحاظ سے بھی درست ہے کہ صَرفی قواعد کے مطابق لفیف مقرون (فعل) میں تعلیل صرف لام کلمہ میں ہوتی ہے عین کلمہ میں نہیں ہوتی ۔ ایک "یاء " کے ساتھ پڑھنے میں لام کلمہ اور عین کلمہ دونوں میں تعلیل کردی جاتی ہے ۔ جس کی افعال میں کوئی مثال نہیں ملتی ۔ ہوسکتا ہے کہ کثرتِ استعمال کی بناء پر یہ ہی دوسری " یاء " کو بھی گرادیا جاتا ہو ۔ بہرحال یہ اہلِ حجاز کی لغت نہیں اور قرآن کریم میں استعمال بھی نہیں ہوئی ۔

● زیرِ مطالعہ آیت میں اس فعل کے دوسرے (مندرجہ بالا) معنی (یعنی زندہ بچالینا) تو فٹ نہیں آتے ۔ اس لیے اردو فارسی تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ " شرمانا ، جھینپنا ، عار کرنا ، شرم کرنا " سے ہی کیا ہے ۔ مثلاً " اللہ کچھ شرماتا نہیں ، نہیں جھینپتا ، حیاء نہیں فرماتا ، عار نہیں کرتا ، ذرا نہیں شرماتا ،، کی صورت میں ۔ البتہ بعض مفسّرین نے تیسرے معنی (باقی چھوڑنا) کو سامنے

d.com

رکھتے ہوئے (اور بعض اہل لغت کے "استحیاء" کے ایک معنی استبقاء یعنی باقی چھوڑنا ـ بیان کرنے کی وجہ سے) "ان اللہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما" ــــ کے معنی "اللہ کسی (چھوٹی سے چھوٹی) چیز کو بھی نہیں چھوڑتا مثال بیان کرنے کے لیے" کی صورت میں بیان کئے ہیں ـ تاہم کسی مترجم نے ان معنی کو نہیں لیا ـ اور عام مفسرین نے بھی اسے (غالباً تکلف سمجھتے ہوئے) نظر انداز کیا ہے ـ

۲ : ۱۹ : ۱ (۲) [اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلاً مَّا] یہ چار کلمات (اَنْ + یَضْرِبَ + مَثَلاً + ما) کا مجموعہ ہے جن کی الگ الگ وضاحت کی جائے گی ـ تاہم ان سب کو یکجا اس لیے لیا گیا ہے کہ ان سب کے ملنے سے ہی عبارت کا ایک مربوط مفہوم سامنے آتا ہے ، جیسے آخر پر بیان کیا جائے گا ـ

● [اَن] ایک حرف ہے[۱] جو زیادہ تر چار قسم کا (یعنی چار طرح استعمال) ہوتا ہے :

(۱) اَن ناصبہ : جو مضارع پر داخل ہو کر اسے نصب دیتا ہے اس کا عام ترجمہ "کہ" کیا جاتا ہے لیکن بلحاظ مفہوم یہ مصدریہ ہوتا ہے اس لیے اسے "اَنْ مصدریہ" بھی کہتے ہیں یعنی اَنْ کے بعد والے مضارع کا مصدری معنی بھی لیا جا سکتا ہے اسے مصدر مؤوّل کہتے ہیں جیسے یہاں "اَن یضرب مثلاً" کا مطلب "ضَرْبَ مثلٍ" (مثال بیان کرنا) ہے ـ کبھی یہ (اَنْ) ماضی پر بھی آتا ہے وہاں ماضی پر عمل تو نہیں کرتا مگر معنی میں مصدریت پیدا ہو جاتی ہے ـ

---

[۱] بعض علماء نحو نے اسے اسم (ضمیر) بھی شمار کیا ہے جو "انا (متکلم) ، اور انتَ ، انتما ، انتم ، انتن (مخاطب کی ضمیروں) کے شروع میں آتا ہے اور "انا" کو "اَنَ" پڑھنے کی وجہ یہی ہے ـ اور "اَنْ" بمعنی "میں" بھی استعمال ہوتا ہے ـ اور مخاطب کی ضمیروں میں "ت" کی مختلف شکلیں حرفِ خطاب کی طرح ہیں جیسے ذٰلکَ میں کاف بدلتا رہتا ہے ـ بہر حال یہ خالص فنی بحث ہے جس کا عملی استعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے

© rasailojaraid.com

جیسے "بل عجبوا اَنْ جاءھم منذر (ق : ۲) میں ہے کہ "مجئ منذر" (ڈرانے والے کا آنا) کے ساتھ ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ کبھی یہ ("اَنْ" مصدریہ) عبارت کے شروع میں آکر مصدر کو مبتداء بنا دیتا ہے یعنی "اَنْ" محلاً مرفوع ہوتا ہے جیسے "ان تصوموا خیر لکم (البقرہ : ۱۱۱) میں "صیامکم" کے معنی دیتا ہے۔ اسی طرح کسی جملے میں "اَن" اپنے مضارع کے ساتھ بلحاظ موقع نصب اور جر میں بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کا مصدر مؤول بنائیں تو وہ محل نصب یا جر میں آتا ہے۔ اس کی مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔ ہر ایک کی اپنی جگہ وضاحت ہوگی۔ انشاء اللہ۔

(۲) "اَنْ" مخففہ: کبھی یہ (اَنَ) أَنَّ (مشددہ) کی مخففہ شکل ہوتی ہے۔ اس وقت یہ مضارع کو نصب نہیں دیتا جیسے علم اَنْ سیکونُ (المزمل : ۲۰) ترجمہ اس کا بھی "کہ" سے ہی ہوگا۔

(۳) "اَنْ" مفسرہ: کبھی یہ مفسرہ ہوتا ہے یعنی عربی کے "اَیْ" اور انگریزی کے i.e. کا کام دیتا ہے۔ اس وقت اس کا ترجمہ "یعنی کہ" سے کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کی بکثرت مثالیں ہمارے سامنے آئیں گی۔

(۴) اَن زائدہ: کبھی یہ صرف تاکید کے لیے آتا ہے یعنی مندرجہ بالا معانی میں سے کسی کے لیے نہیں ہوتا جیسے "فلما اَنْ جاء البشیر (یوسف : ۹۶)

(۵) کبھی یہ "لِئَلَّا = لِاَنْ لَّا" کے معنی میں بھی آتا ہے اس کا ترجمہ "تاکہ ایسا نہ ہو کہ" سے کیا جاتا ہے جیسے یبین اللّٰہ لکم ان تضلوا (النساء : ۱۷۶)

● یہاں ہم نے "اَنْ" کی اقسام اور ان کے استعمال کی بات قدرے تفصیل سے اس لئے کی ہے کہ آگے چل کر ہم "اَن" کے بارے میں صرف یہ بتا دینا کافی سمجھیں گے کہ یہاں "اَنْ" مصدریہ ناصبہ ہے یا مفسرہ یا مخففہ یا زائدہ برائے تاکید — وغیرہ اور اوپر جن آیات کے حوالے بطور مثال دیئے گئے ہیں ان کی وضاحت بھی اپنے اپنے موقع پر کی جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

● [یَضْرِبَ] کا مادہ "ض ر ب" اور وزن "یَفْعِلَ" ہے (جو فعل مضارع کی منصوب صورت ہے)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "ضَرَبَ ... یَضْرِبُ ضَرْبًا" باب ضَرَبَ سے آتا ہے بلکہ "باب ضرب" کے نام رکھنے کی وجہ یہی فعل ہے جسے ماضی مفتوح العین اور مضارع مکسور العین والے فعل کے لیے بطور مثال برائے اختصار اختیار کیا گیا ہے۔ اس فعل (ضرب یضرب) کے بنیادی معنی "ہاتھ یا چھڑی وغیرہ سے مارنا، پیٹنا" ہیں۔ مگر مختلف صلات (مثلاً فِی، عَلٰی، بِ، عَنْ) کے ساتھ اور اس قسم کے صلہ کے بغیر بھی ـــ بطور متعدی اور لازم متعدد معانی اور محاوروں میں استعمال ہوتا ہے۔ کتب لغت میں اس کے چالیس سے زیادہ استعمالات اور معانی مذکور ہوئے ہیں (مزید فیہ افعال کے معنی اس پر مستزاد ہیں)۔ خود قرآن کریم میں یہ کم از کم پانچ مختلف معانی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ حسبِ موقع اس کے معانی سب موقع بیان کئے جائیں گے۔ ان میں سے ایک استعمال یہ

● [یضرِبَ مَثَلاً] کا ہے۔ "ضرَبَ مثلاً" کے معنی ہیں "مثّل تمثیلاً" یعنی "اس نے ایک تمثیل، یا کہاوت یا مثال بیان کی" ـــ [مَثَلٌ (اسم) اور مَثَّلَ (فعل) کے معنی اور استعمال پر البقرہ: ۱۷ یعنی ۲:۱۳:۱(۱) میں بات ہو چکی ہے]۔ اسی لیے اردو کے تمام مترجمین نے یہاں "اَنْ یضرِبَ" کا ترجمہ "بیان کرنا" یا "ذکر کرنا" کے ساتھ ہی کیا ہے۔

صرف اسی استعمال (ضرب مثلاً) کی مختلف صورتیں اور صیغے قرآن کریم میں پچیس[۲۵] کے قریب مقامات پر آئے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن کریم میں یہ فعل صرف ثلاثی مجرد سے ہی استعمال ہوا ہے یعنی اس سے مزید فیہ کا کوئی فعل قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اور فعل مجرد سے (ماضی، مضارع، امر، نہی وغیرہ کے) مختلف صیغے اور مصادر ساٹھ کے قریب جگہ وارد ہوئے ہیں۔ ضرب کے دوسرے معانی اور استعمالات پر حسب موقع بات ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● [مثلاً مَا] کا "مَا" ابہامیہ ہے جو کسی نکرہ کے ساتھ مل کر اسے

---

[۲۵] حاشیہ اگلے صفحہ پر

© rasailojaraid.com

مزید " نکرہ تر" کر دیتا ہے یعنی اس میں زیادہ عموم اور ابہام پیدا کرتا ہے اور ایک طرح سے یہ اپنے سے ماقبل اسم (نکرہ) کی صفت کا کام دیتا ہے۔ اور اس اسم کی رفع نصب یا جر کے لحاظ سے اسے بھی مرفوع منصوب یا مجرور کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مبنی ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی اعرابی علامت ظاہر نہیں ہوتی مثلاً ہم کہیں گے (۱) هل عندك كتابٌ ما ؟ کیا آپ کے پاس کسی قسم کی (کوئی بھی) کتاب ہے؟ یا آپ کہہ سکتے ہیں (۲) اعطنی کتاباً ما ۔ جس کا مطلب ہوگا "مجھے کوئی سی کتاب (جو بھی آپ چاہیں) دیجئے ۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں (۳) هل قرأتَ فی کتابٍ ما ؟ یعنی کیا تو نے کسی بھی کتاب میں پڑھا ہے ؟ ۔ (مندرجہ بالا جملوں میں لفظ " کتاب " علی الترتیب رفع نصب اور جر میں استعمال ہوا ہے)۔ " مَا " کے خط کشیدہ معنی قابل توجہ ہیں ۔۔۔ " ما " کے اسی استعمال کی بنا پر اردو مترجمین نے یہاں " مَثلاً مّا " کا ترجمہ " کوئی سی مثال " " کوئی مثال بھی" یا صرف " کوئی مثال " سے کیا ہے ۔

● تمام مشتمل علیہ کلمات کی اس الگ الگ وضاحت کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عبارت (اَنْ یَضرِبَ مَثلاً مَا) کا بالکل لفظی ترجمہ تو ہوگا : " کہ وہ بیان کرے مثال کوئی سی بھی "۔ اسی کو مختلف مترجمین نے " کہ بیان کرے کوئی مثال " ، " کہ بیان کردے کوئی مثال بھی " ، " کہ کسی چیز کی مثال بیان کرے " سے ترجمہ کیا ہے ۔ بعض نے " اَن " کے مصدری استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے (جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) اس کا عبارت کا ترجمہ " مثال بیان کرنے میں " ، " کسی مثال کے بیان کرنے میں " (نہیں شرماتا ، جھینپتا) اور بعض نے مزید وضاحت کے لیے " کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہو ، چیز کا ذکر فرمائے " کی صورت میں ترجمہ کیا جسے تفسیری ترجمہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ " سمجھانے کو " کے لیے اصل عبارت میں

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)[۱] " مَا " کے بعض استعمالات پر البقرہ : ۳ یعنی ۲:۲:۱(۵) میں بات ہوئی تھی ۔ یہ مَا (ابھامیہ) وہاں مذکور نہیں ہوا تھا ۔ اس لیے اس کی وضاحت یہاں کی گئی ہے ۔

تو کوئی لفظ نہیں تاہم مفہوم یہی ہے ۔

۲ : ۱۹ : ۱ (۳) [بَعُوْضَةً] کا مادہ " ب ع ض " اور وزن " فَعُوْلَةٌ " ہے (جو عبارت میں منصوب واقع ہوا ہے جس کی وجہ آگے " الاعراب " میں بیان ہو گی)۔ اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد " بعَض ...... یبْعَض بعضًا (البعُوضُ) ۔ باب فتح سے آئے تو اس کے معنی ہیں : ...... کو " بعوض " (مچھروں) نے کاٹا اور ستایا " ۔ یہ فعل اس باب سے (بمعنی " کاٹنا ") صرف مچھر کے لیے اور اس کے ذکر (بعوض) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یا پھر بصیغۂ مجہول " بُعِضَ " (بمعنی وہ کاٹا گیا یعنی اسے مچھروں نے کاٹا) استعمال ہوتا ہے، (جیسے زُکِمَ = اسے زکام ہو گیا اور سُرَّ = وہ خوش ہوا) میں فعل مجہول استعمال ہوتا ہے) ۔ ثلاثی مجرد کے علاوہ عام عربی میں یہ مادہ مزید فیہ کے بعض ابواب (مثلاً افعال، تفعیل اور تفعل) سے بھی مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

—— تاہم قرآن کریم میں تو اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ قرآن کریم میں تو اس مادہ سے ماخوذ صرف دو ہی لفظ آئے ہیں ۔ ایک تو " بَعْضٌ " ، جو مختلف تراکیب کے ساتھ قرآن کریم میں ۱۲۹ جگہ آیا ہے (اور جس کے معنی و استعمال کے متعلق اپنے موقع پر بات ہو گی) ۔
دوسرے یہ زیر مطالعہ لفظ " بعوضۃ " ہے جو صرف اسی ایک جگہ آیا ہے ۔

● لفظ " بعوض " کے معنی " مچھر " ہوتے ہیں ، جب کہ اس کا ذکر بطور ایک جنس کے کیا جا رہا ہو جیسے " ثمرٌ " (پھل کی جنس) اور " شجرٌ " (درخت کی جنس) کے لیے آتا ہے ۔ اس قسم کے الفاظ کے آخر پر تائے وحدت (ۃ) لگنے سے ان میں (اپنی جنس کے) ایک (فرد) کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ شجرۃٌ = ایک درخت، ثمرۃٌ = ایک پھل ۔ اسی طرح " بعوضۃ " کے معنی ہوئے " ایک مچھر " ۔ بعض اہل لغت (مثلاً فیروز آبادی) نے " بعوض " کو " بعوضۃ " کی جمع بھی سمجھا ہے ۔ (اسم جنس بھی بمعنیٔ جمع استعمال ہوتا

© rasailojaraid.com

ہے)۔بہرحال "بعوضۃ" کے معنی "ایک یا کوئی مچھر" ہی ہیں۔ راغب وغیرہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسے "بعوضۃ" کہنے کی وجہ اس کا "چھوٹا سا" ہونا ہے۔گویا اسے "بعض" (بمعنی "کچھ") سے ایک معنوی مناسبت ہے۔

۲:۱:۱۹ (۴) [فَمَا فَوْقَهَا] جو "فَ" + مَا + فوقَ + ھا کا مرکب ہے۔ اس میں "فَ" (فاء) عاطفہ ہے جس کا عام ترجمہ "پس" ہے۔ بعض نے یہاں اسے "اِلی" (تک) کے معنی میں لیا ہے[1] اردو میں محاورے کی خاطر اس "فَ" کا ترجمہ "یا" سے کیا جاتا ہے۔گویا یہاں "ف" بمعنی "اَو" استعمال ہوا ہے۔ "ما" موصولہ ہے جس کا ترجمہ "جو کچھ کہ" یا صرف "جو کہ" ہے۔ آخری "ھا" ضمیر مجرور بمعنی "اس کا/کے/کی" ہے جس کی طرف "فوق" مضاف ہے۔کلمہ "فوق" کا مادہ "ف و ق" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔اس مادہ سے فعل مجرد (ثلاثی) فاق یفوق — دراصل فوَق یفوُق — فَوْقًا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معروف معنی ہیں: "بلند ہونا، اوپر ہونا، فائق ہونا"۔اور بعض دوسرے مصادر کے ساتھ اور دوسرے ابواب (مثلاً سمع) سے یہ دیگر معانی کے لیے بھی آتا ہے مثلاً ہچکی آنا۔تیر کا ٹیڑھا ہونا وغیرہ عربی زبان میں تو اس مادہ سے مزید فیہ کے بعض ابواب (مثلاً اِفعال، تفعل) سے بھی مختلف معنی کے لیے افعال استعمال ہوتے ہیں۔قرآن کریم میں اس کے فعل ثلاثی مجرد سے تو کسی معنی کے لیے کوئی صیغۂ فعل نہیں آیا۔اور مزید فیہ کے بھی باب افعال سے صرف ایک صیغۂ فعل استعمال ہوا ہے (الاعراف : ۱۴۳)۔البتہ لفظ "فَوْقَ" مختلف تراکیب کے ساتھ قرآن کریم میں چالیس سے زیادہ جگہ وارد ہوا ہے۔ اور اسی مادہ سے ماخوذ ایک اسم "فواق" بھی صرف ایک جگہ (صٓ: ۱۵) آیا ہے — جس پر اپنی جگہ بات ہوگی۔ انشاء اللہ تعالےٰ۔

---

[1] اعراب القرآن (للنحاس) ج ۱ ص ۲۰

● کلمہ "فَوْقٌ" جو اگرچہ مصدر ہے مگر زیادہ تر بطور ظرف مکان اور کبھی کبھار بطور ظرف زمان استعمال ہوتا ہے اور اس لیے مضاف اور منصوب ہو کر (بصورت "فَوْقَ") استعمال ہوتا ہے۔ اور بلحاظ معنی اس میں اونچائی، بلندی اور برتری کا مفہوم ہوتا ہے جس کا اردو ترجمہ "..... سے اونچا، ..... کے اوپر" (تَحْتَ) اور "دُوْنَ" کی ضد) سے کیا جاتا ہے مثلاً کہتے ہیں "فوقَ الارضِ" (زمین سے اونچا یا اوپر) یا "فوقَ الشھرِ" (مہینے سے اوپر یعنی کچھ زیادہ)۔ اور اس سے پہلے "مِنْ" لگنے سے مجرور بھی آتا ہے جیسے "مِنْ فوقِھِم" میں ہے۔ اور اگر اس کا مضاف الیہ محذوف ہو تو (قَبْلُ یا بَعْدُ) کی طرح یہ بھی مبنی بر ضمہ ہو جاتا ہے (تاہم قرآن کریم میں یہ مبنی بر ضمہ والی ترکیب "مِنْ فوقُ" کہیں مستعمل نہیں ہوئی)۔

● آیت زیر مطالعہ میں "فوقَ" کا لفظ "چھوٹے پن" کی وضاحت کے لیے آیا ہے یعنی "مچھر یا چھوٹے پن میں اس سے بھی اوپر (بڑھ کر) کوئی شے"۔ اس لیے یہاں "فوقَ" سیاق و سباق (CONTEXT) اور محاورے کے لحاظ سے "دُوْنَ" (کم تر۔ نیچے) کے معنوں میں آیا ہے اور یہ مفہوم صحابہؓ و تابعینؒ سے ثابت ہے۔ بلکہ یہ "فما فوقھا" والا محاورہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے جس کا بیان کرنا یہاں اس کے معنی سمجھنے میں مدد دے گا۔ فرمایا کہ ــــ "ما من مسلمٍ یشاکُ شوکۃً فما فوقھا الا کُتِبَتْ لہ بھا درجۃٌ و مُحِیَتْ عنہ خطیئۃٌ"[1] (کسی مسلمان کو اگر کانٹا بھی چبھتا ہے یا اس سے بڑی / یا اس سے چھوٹی (جو بھی تکلیف پہنچتی ہے) تو اس کا یا تو درجہ کچھ بلند ہو جاتا ہے یا کوئی گناہ مٹا دیا جاتا ہے) اس حدیث شریف میں "فما فوقھا" کے معنی "اس سے چھوٹا یا بڑا" دونوں ہی لئے جا سکتے ہیں۔ مگر زیر مطالعہ آیت میں "بعوضۃً" (مچھر) کے ضمن میں

---

[1] الجامع الصغیر ج ۲ ص ۱۱۹ بحوالہ مسلم عن عائشہؓ

© rasailojaraid

" فما فوقھا " کے آجانے سے " اس سے چھوٹے پن میں اوپر " یا " اس سے بھی کم تر " کا مفہوم آگیا ہے ۔ اگرچہ بیشتر اردو مترجمین نے یہاں لفظ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ " اس سے اوپر " ، " جو اس سے بڑھ کر ہے " کیا ہے ، تاہم بعض نے اس کا ترجمہ " خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو " ، " یا اس سے بڑھ کر (بھی اور حقیر چیز کی) " ، " یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور چیز) " کی صورت میں کیا ہے اور اس طرح " خواہ " اور " یا " کے ذریعے وہی " حقیر تر " والا مفہوم ظاہر کیا ہے ۔

۲:۱۹:۱(۵) [فَاَمَّا] میں " فَ " تو عاطفہ ہے جو یہاں " پس ، پھر ، سو ، تو " کے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ " اَمَّا " ایک ایسا حرف ہے (اسم ، فعل ، حرف کی تقسیم کے معنی میں) جس میں " شرط " اور " تفصیل " کے معنی ہوتے ہیں ۔ اسے " شرطیہ " تو صرف اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بعد آنے والے اسم (یا جملہ) پر " فَ " بمعنی " تو " ضرور داخل ہوتا ہے جو ایک طرح سے جوابِ شرط (یا شرط کا حرفِ ربط) ہے ۔ ورنہ اس (اَمَّا) کے بعد کوئی فعل مجزوم (اسماء یا حروفِ شرط کی طرح) نہیں آتا ___ اور یہ (اَمَّا) حرفِ تفصیل (یا تاکید) اس لیے ہے کہ اس کے ذریعے کسی چیز کی تفصیل یا وضاحت مطلوب ہوتی ہے ۔ یا اس کے بارے میں کسی تاکید کا پتہ چلتا ہے ۔

اردو میں اس (اَمَّا) کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اور اسی لیے بیشتر مترجمین نے اس کا ترجمہ ہی نہیں کیا ___ زیادہ سے زیادہ جو لفظ " جو تو " سے کام چلایا جا سکتا ہے ۔ انگریزی میں اس کا بدل " AS FOR ' یا ' AS FAR AS ' یا ' AS TO " ہے ۔ فارسی والے اصل " اما " کو ہی استعمال کرتے ہیں ۔ اس (اما) کے استعمال سے عبارت کا مفہوم کچھ اس طرح بنتا ہے ۔ " جو تو ... (ایسے ہیں) تو ..... (ان کو) " ، " جہاں تک ..... کا تعلق ہے تو ..... " یہی وجہ ہے کہ عموماً اس (اَمَّا) کے بعد کوئی اسم موصول (شرط کے مفہوم میں) آتا ہے ۔

جیسے "اَمَّا مَنْ ....." یا "اما الذین ....." میں ہے یا اس کے بعد کوئی معرف باللام اسم آتا ہے جس کے "ال" میں "الذی" (یعنی وہ جو) کا مفہوم موجود ہوتا ہے جیسے "اما السائل (الضحیٰ : ۱۰) ..... یا فاما الزبد (الرعد : ۱۷) ....." میں ہے ــــ "اما" کسی اسم موصول یا معرف باللام اسم کے بغیر بھی استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم اس کے بعد کوئی اسم ہی آتا ہے ۔ جیسے "اما بنعمة ربك ..... (الضحیٰ : ۱۱)" میں ہے ۔ ہر صورت میں یہ (اَمَّا) اس چیز کے ذکر سے پہلے آتا ہے جس کے بارے میں کوئی تفصیل یا تاکید مطلوب ہوتی ہے ۔ اور جو عبارت (یا جملہ) تفصیل کے لیے آتا ہے اس پر "ف" ضرور داخل ہوتا ہے ۔ جیسے یہاں زیر مطالعہ آیت میں "فاَمَّا الذین آمنوا....." اور "واما الذین کفروا....." کے بارے میں تفصیل یا وضاحت "فیعلمون....." اور "فیقولون ....." سے شروع ہوتی ہے ۔

[الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا] میں "الذین" تو اسم موصول بمعنی "وہ سب جو" ہے اور "آمنوا" کا مادہ "ا م ن" اور وزن اصلی "اَفْعَلُوْا" ہے اور اس کی اصلی شکل "أَأْمَنُوْا" تھی ۔ اس مادہ اور خصوصاً اس کے باب اِفعال (آمن یؤمن ایمانًا = ایمان لانا) اور اس کے معنی وغیرہ نیز اس میں صرفی تبدیلی (أَأْ سے آ بننا) پر مفصل بات البقرہ : ۳ یعنی ۲ : ۲ : ۱ (۱) میں ہو چکی ہے ۔ اس طرح "فاما الذین آمنوا" کا ترجمہ بنتا ہے "پس جو تو ہیں ایسے جو کہ ایمان لائے" ۔

[فَيَعْلَمُوْنَ] میں "فَ" تو "اَمَّا" کے جواب میں آنے والی "فاء" (رابطہ) ہے جس کا اردو ترجمہ "تو" سے کیا جا سکتا ہے ، اور "یعلمون" کا مادہ "ع ل م" اور وزن "یَفْعَلُوْنَ" ہے ۔ یعنی یہ فعل مضارع کا صیغہ مضارع معروف ہے ۔ اس مادہ سے فعل مجرد (عَلِمَ یعلَم علمًا : جان لینا) کے باب اور معنی وغیرہ پر البقرہ : ۱۳ یعنی ۲ : ۱ : ۱ (۳) میں بات ہو چکی ہے ۔ اس طرح "فیعلمون" کا ترجمہ ہے "تو وہ تو جانتے ہیں" ۔

© rasailojaraid.com

[أَنَّهُ] یہ "اَنَّ" (کہ یقیناً ، بےشک) + "ہٗ" (وہ) کا مرکب ہے۔

۲:۱۹:۱(۶) [اَلْحَقُّ] کا مادہ "ح ق ق" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعَلٌ" ہے۔ اس کی اصلی شکل حَقَقٌ تھی جس میں ساکن "ق" کا متحرک "ق" میں ادغام ہو کر لفظ "حقٌّ" رہ جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "حَقَّ یَحِقُّ (دراصل حَقَقَ یَحْقِقُ) حَقًّا (باب ضرب سے) آتا ہے اور بقول راغب اس کے بنیادی معنی ہیں: "موافقت اور مطابق ہونا" یعنی کسی چیز کا اپنی جگہ کے موافق اور مطابق واقع ہونا۔ پھر اس سے اس میں "درست ثابت ہونا، واجب ہونا، سچ ہونا، ٹھیک ہونا، حقیقت بن جانا، برقرار رہنا، پکا ہونا، لازم ہونا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ زیادہ تر تو بطور فعل لازم استعمال ہوتا ہے۔ تاہم کبھی اسی باب (ضرب) سے مگر زیادہ تر باب نصر سے (حَقَّ یحُقُّ) بطور فعل متعدی بھی آتا ہے اور اس کے معنی "ثابت کرنا، واجب کرنا، گرہ کو مضبوط باندھنا، کسی چیز کی حقیقت پالینا یا سمجھ لینا" ہوتے ہیں۔ اس طرح بعض معنی کے لیے یہ فعل (لازم اور متعدی سے) معروف اور مجہول دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ایک لحاظ سے "حَقَّ" اور "حُقَّ" کے معنی ایک ہی بنتے ہیں یعنی "واجب ہونا یا واجب کر دیا جانا" البتہ اس فعل کے استعمال کا محاورہ مختلف ہے۔ مثلاً اگر کہنا ہو "تجھ پر واجب (ثابت) ہے کہ ......" تو عربی میں فعل معروف "علی" کے صلہ کے ساتھ آئے گا یعنی کہیں گے "حقَّ علیكَ اَنْ ......" اور اگر کہنا ہو "تیرے لیے درست ہے کہ ...." یا "تیرا حق ہے کہ ......" تو فعل مجہول لام (لِ) کے صلہ کے ساتھ آئے گا مثلاً کہیں گے "حُقَّ لكَ اَنْ ....."

● قرآن کریم میں یہ فعل (مجرد) لام (لِ) کے صلہ کے ساتھ استعمال نہیں ہوا۔ بطور فعل لازم اس کے مختلف صیغے (ماضی، مضارع) اٹھارہ[۱۸] جگہ آئے ہیں۔ ان میں سے چار جگہ متعلق فعل جار مجرور (علی کے صلہ کے ساتھ) نہیں آیا، باقی مقامات پر "علی ...." کے ساتھ آیا ہے اور صرف دو جگہ اس فعل سے ماضی مجہول کا صیغہ

(حُقَّتْ) آیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید فیہ کے ابواب افعال اور استفعال سے بھی کچھ صیغے اور بعض دیگر مشتقات ۲۷ جگہ .... وارد ہوئے ہیں۔

● کلمہ "الحق" جو مذکورہ بالا فعل مجرد کا مصدر بھی ہے اور بطور اسم بھی متعدد ملتے جلتے معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں ۲۳۰ دفعہ آیا ہے اور حسب موقع اس کا اردو ترجمہ فعل مجرد کے (مذکورہ بالا) معانی کی روشنی میں کئی طرح کیا جاسکتا ہے، مثلاً "سچ"، "سچائی"، سچا، ٹھیک، درست، حقیقت کے مطابق، انصاف کے مطابق، واجب، حصہ، ضرورت، یقینی، ثابت اور حق (بمقابلہ باطل) اردو میں مستعمل ہے۔ اس لیے بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ "حق" ہی رہنے دیا ہے۔

[مِنْ رَّبِّهِمْ] یہ "مِنْ" (کی طرف سے) + رَبِّ (پروردگار) + هِمْ (ان کا) سے مرکب ہے۔ اس میں "مِنْ" جزویت یا تبعیضیت کے لیے نہیں بلکہ "بیانیہ" ہے۔ (ضرورت ہو تو مِنْ کے استعمال و معانی کے لیے ۲:۲:۱(۵) کو دیکھ لیجئے) اس کا ترجمہ "میں سے" کی بجائے "کی طرف سے"، کی جانب سے "کیا جائے گا۔ یعنی "مِنْ رَبِّهِمْ" کا ترجمہ "ان کے ربّ کی طرف سے یا جانب سے" ہوگا۔ بعض نے بیان اور وضاحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ "ان کے ربّ کا کہا"، یا "جو نازل ہوئی ان کے ربّ کی طرف سے" اور "ان کے ربّ کی طرف سے کہی ہوئی بات" کی صورت میں کیا ہے۔ ان تراجم میں "کا کہا"، "جو نازل ہوئی" اور "کہی ہوئی بات" کے الفاظ کو سیاقِ عبارت اور مفہوم کے لحاظ سے ہی درست کہا جاسکتا ہے ورنہ نص (الفاظ یا اصل عبارت) سے تو ذرا ہٹ کر ہیں۔

[وَ اَمَّا] یہ ابھی اوپر بیان کردہ "فَاَمَّا" کی مانند ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہوگا: "اور جو تو......"، "اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو...."، "رہ گئے وہ لوگ جو......"، "رہے......" بعض نے اس کا ترجمہ صرف

© rasailojaraid.com

" البتہ " سے ہی کر دیا ہے۔

[اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا] میں " اَلَّذِیْنَ " اسم موصول (بمعنی وہ لوگ جو کہ، جنہوں نے کہ) ہے اور " کفروا " کا مادہ " ک ف ر " اور وزن " فَعَلُوْا " ہے ۔جو اس مادہ سے فعل مجرد (کفر یکفُر = "انکار کرنا") سے فعل ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے ۔اس فعل کے معنی و استعمال کی بحث کے لیے البقرہ : ۶ یعنی ۲ : ۵ : ۱ (۱) دیکھئے ۔ اس کا اردو ترجمہ بنتا ہے " وہ جو کافر ہوئے "۔ اسی کو بعض نے " وہ جو کافر ہیں " اور بعض نے صرف " کافر " سے ترجمہ کیا ہے ۔

[فَیَقُوْلُوْنَ] میں " فَ " (فاء) عاطفہ بمعنی " پس " یا " سو " ہے اور " یقولون " کا مادہ " ق و ل " اور وزن اصلی " یَفْعُلُوْنَ " ہے ،جس کی اصل شکل " یَقْوُلُوْنَ " تھی جس میں واو متحرکہ (جو عین کلمہ ہے) کی حرکت اس سے ماقبل والے حرف صحیح (جو یہاں " ق " ہے) کو دے دی جاتی ہے اور کلمہ " یقولون " بنتا ہے ۔اس مادہ سے فعل مجرد (قال یقول = کہنا) کے باب اور معنی و استعمال کی بات البقرہ : ۸ یعنی ۲ : ۷ : ۱ (۵) میں گزر چکی ہے ۔

● اس طرح " یقولون " (جو فعل مجرد سے صیغہ مضارع جمع مذکر غائب ہے) کا ترجمہ تو بنتا ہے " وہ کہتے ہیں یا کہیں گے " ۔ اکثر مترجمین نے فعل حال سے ترجمہ کیا ہے یعنی " وہ کہتے ہیں " ۔تاہم بعض حضرات نے آیت کے مجموعی مضمون (کفار کے اعتراض) کو سامنے رکھتے ہوئے " یقولون " کا ترجمہ " یوں ہی کہتے رہیں گے " اور " وہ تو یہی کہتے رہیں گے " کے ساتھ کیا ہے جو مفہوم کو ذرا بہتر ظاہر کرتا ہے ۔

۲ : ۱۹ : ۱ (۷) [مَاذَا] یہ " ما " استفہامیہ (دیکھئے ۲ : ۲ : ۱ (۵)) کے ساتھ کلمہ " ذا " مل کر بنا ہے ۔ عموماً یہ مرکب خود ایک ہی لفظ یعنی کلمۂ استفہام

سمجھا جاتا ہے ۔ زیادہ تر یہ غیر عاقل اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی بھی وہی "مَا" والے یعنی "کیا ؟" ہی ہوتے ہیں۔ بعض نحویوں کے نزدیک یہ "مَا" استفہامیہ اور "ذا" اسم موصول (" الذی" کے معنی میں) سے مرکب ہے [1] اس صورت میں اس کا ترجمہ "کون سی چیز" ، کیا کچھ" یا "کیا ہے وہ جو ...." سے کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح یہ (ماذا) جملہ میں مبتدا بن کر بھی آسکتا ہے جیسے " ماذا عندکَ ؟" میں ہے ۔ اور مفعول بہ ہو کر بھی آسکتا ہے جیسے " ماذا فعلْتَ" ؟ میں ہے ۔

● بیشتر اردو مترجمین نے یہاں اس (ماذا) کا ترجمہ "کیا ؟" ہی کیا ہے اگرچہ بعض نے "وہ کون (مطلب)" اور "کون سی (غرض)" کے ساتھ بھی ترجمہ کیا ہے ۔

۲ : ۱۹ : ۱ (۸) [اَرَادَ اللّٰہُ] کے دوسرے جزء (اسم جلالت ۔ اللّٰہ) کے لغوی پہلوؤں پر سورۃ الفاتحہ کے شروع میں " بسم اللہ " کے ضمن میں بحث گزر چکی ہے ۔

" اَرَادَ " کا مادہ " ر و د " اور وزن اصلی " اَفْعَلَ " ہے ۔ اس کی شکل اصلی " اَرْوَدَ " تھی جس میں واو متحرکہ (عین کلمہ) کی حرکت اس کے ماقبل حرف صحیح (ر) کو دے کر خود " و " کو ماقبل کی حرکت (فتحہ) کے موافق حرف (الف) میں بدل بولا اور لکھا جاتا ہے ۔ یوں اس کی شکل " اراد " اور وزن " اَفَالَ " رہ جاتا ہے ۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " رَادَ ..... یرود (در اصل رَوَدَ یرْوُدُ) رَوْدًا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہوتے ہیں : "..... کو طلب کرنا ، ..... کو چاہنا " یہ فعل بعض دیگر معنی بھی رکھتا ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا۔ قرآن کریم میں

---

[1] اعراب القرآن (للنحاس) ج ۱ ص ۱۴۰ نیز التبیان (للعکبری) ج ۱ ص ۴۳ - ۴۴

© rasailojaraid.c

یہ مادہ زیادہ تر بابِ افعال سے آیا ہے (۱۳۸ جگہ) اور کچھ صیغے (۸ جگہ) باب مفاعلہ سے آئے ہیں۔

● "اَرَادَ" اس مادہ سے بابِ اِفعال کے فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے۔ اس باب سے فعل "اراد ..... یرید (دراصل اَرْوَدَ یُرْوِدُ) اِرَادۃً [اجوف کے باب افعال اور استفعال کے مصدر اپنے اصل وزن (افعال اور استفعال) کی بجائے تعلیل ہوکر "اِفالَۃ" اور "استفالَۃ" کے وزن پر آتے ہیں] کے معنی ہیں: "..... کا قصد کرنا"، "..... کا مطلب لینا (نکالنا)"۔ بلکہ اس فعل کا مصدر "ارادہ" خود بھی اردو میں اپنے اصل عربی معنی (چاہنا) میں مستعمل ہے، اس لیے اس کا ترجمہ "ارادہ کرنا" ہی کر لیا جاتا ہے اور اس فعل سے اسم الفاعل "مُرِیْدٌ" (دراصل مُرْوِدٌ) بمعنیٰ "ارادہ کرنے والا" اور اسم المفعول "مُرَاد (دراصل مُرْوَدٌ) بمعنیٰ "جس کا ارادہ کیا گیا" بھی اردو میں متعارف اور متداول ہیں۔ اس لیے اردو میں "اَرَادَ" کا ترجمہ "مراد لینا" بھی کیا جا سکتا ہے۔

● اس طرح اس پورے فقرے "ماذا اراد اللّٰہ" کا ترجمہ "اللہ نے کیا چاہا؟" اور "اللہ کی کیا مراد ہے" سے کیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ بامحاورہ بنانے کے لیے "وہ کون سا مطلب ہوگا؟ کیا مقصود ہے؟، کون سی غرض ہے؟ (یعنی اللہ کا یا اللہ کی)" کی صورت میں بھی ترجمہ کیا ہے۔

[بِھٰذَا مَثَلاً] میں "بِ" (باء الجر) کے معنی ہیں "سے، کے ساتھ"۔ "ھٰذا" اسم اشارہ بمعنی "یہ، اس" ہے۔ اور "مَثَلاً" کا مادہ "م ث ل" اور وزن "فَعَلاً" (بصورت منصوب) ہے۔ اس لفظ "یعنی مَثَلٌ" کے مختلف معنی (مثال، کہاوت، بیان) اور اس مادہ (م ث ل) سے فعل مجرد کے بنیادی مصدری معنی وغیرہ پر البقرہ: ۱۷ [یعنی ۲:۱۳:۱(۱)] میں بات ہو چکی ہے۔

d.com

● اس حصۂ آیت (ماذا اراد اللّٰہ بھٰذا مثلاً) کے الگ الگ کلمات کے معنی جان لینے پر بھی مجموعی طور پر پوری عبارت کا مفہوم صاف نہیں ہوتا۔ اس کے لیے عبارت کی ترکیب نحوی یعنی اعراب کو جاننا ضروری ہے۔ اس لیے اس پر مفصل بات اِن شاءاللہ تعالیٰ ، ابھی آگے بحث " الاعراب " میں آئے گی جس سے نہ صرف آیت کا ترجمہ سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ مختلف تراجم کے باہمی فرق کی وجہ بھی سامنے آئے گی۔

۲:۱۹:۱(۹) [یُضِلُّ بِہٖ] میں "بہ" تو "ب" (باء) مسببیہ بمعنی "کے ساتھ ، کے ذریعے" ہے اور " ہ " ضمیر مجرور بمعنی "اس" ہے۔ یوں " بہ " کا ترجمہ "اس کے ذریعے سے" ، "اس کے سبب سے" ، "اس کی وجہ سے" بنتا ہے۔ "یُضِلُّ" کا مادہ " ض ل ل" اور وزن اصلی " یُفْعِلُ " ہے۔ اس کی اصلی شکل "یُضْلِلُ" تھی جس میں پہلے لام کو ساکن کر کے دوسرے لام میں مدغم کر دیا جاتا ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کے باب ، معنی اور استعمال پر البقرہ : ۱۶ میں (کلمہ " الضلالۃ کے ضمن میں) بات ہو چکی ہے۔ دیکھئے ۲:۱۲:۱(۲) نیز دیکھئے الفاتحہ : ۷ یعنی ۱:۶:۱(۶) میں تحت کلمہ " الضالین "۔ "یُضِلُّ" اس مادہ (ضلل) سے باب اِفعال کا صیغہ مضارع معروف ہے۔ اس باب سے فعل " اَضَلَّ ... یُضِلُّ (دراصل اَضْلَلَ یُضْلِلُ) اِضْلالاً کے معنی ہیں : "...... کو گمراہ کرنا ..... کو بھٹکا دینا" اس لیے بیشتر مترجمین نے " یضل بہ " کا ترجمہ "گمراہ کرتا ہے اس سے" یا "اسی سے" کیا ہے جب کہ بعض نے " بہ " کا ترجمہ " اس مثال سے " کیا ہے جسے تفسیری ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔

۲:۱۹:۱(۱۰) [کَثِیْرًا] کا مادہ "ک ث ر" اور وزن " فَعِیْلٌ " ہے (جو عبارت میں منصوب ہے اس کی وجہ بحث " الاعراب " میں بیان ہو گی)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " کثُر یکثُر کثرۃً (باب کرم سے) آئے تو

© rasailojaraid.com

اس کے معنی "زیادہ ہونا" ہوتے ہیں ۔ اس مادہ سے بعض الفاظ مثلاً "کثیر"، "کثرت" (جو عربی میں "کثرۃ" لکھا جاتا ہے) اردو میں بھی مستعمل ہیں ۔ اس لیے اس فعل (کَثُرَ) کا ترجمہ "کثیر ہونا" اور "بکثرت ہونا" سے بھی کیا جا سکتا ہے ۔

لفظ "کثیر" (زیادہ) اور "قلیل" (تھوڑا) ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں اردو میں مستعمل ہیں ـــــ اس مادہ (ک ث ر) سے فعل مجرد باب نصر ینصر سے بطور فعل متعدی بھی استعمال ہوتا ہے یعنی کَثَرَ .... یکثُرُ کَثْرًا کے معنی "..... پر کثرت کے لحاظ سے غالب ہونا" ہیں ۔ تاہم یہ فعل قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا ۔

● قرآن کریم میں اس مادہ (ک ث ر) سے فعل مجرد صرف باب کرُم سے ہی استعمال ہوا ہے اور اس کے بھی صرف دو ہی صیغے آئے ہیں ۔ البتہ مزید فیہ کے بعض ابواب (افعال، تفعیل اور استفعال) سے اُفعال کے کچھ صیغے ۶ جگہ اور مختلف مشتقات (اسماء و مصادر وغیرہ) تو بکثرت (۵۰ سے زائد مقامات پر) وارد ہوئے ہیں ۔

لفظ "کثیر" اس مادہ سے "فعیل" کے وزن پر صفت مشبہ یا مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: "زیادہ، بکثرت، بہت زیادہ، بہت سے، بہتیرے" ۔ یہ کلمہ بھی قرآن میں کثیر الاستعمال ہے (ساٹھ سے زیادہ جگہ آیا ہے)۔

[وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا] میں "وَ" عاطفہ بمعنی "اور" ہے ۔ "بہ" اور "کثیرا" پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے ۔

فعل "یَھْدِیْ" کا مادہ "ھ د ی" اور وزن اصلی "یَفْعِلُ" ہے ۔ اس کی اصلی شکل "یَھْدِیُ" تھی جس میں آخری "یاء" کو ماقبل مکسور ہونے کے باعث ساکن کر دیتے ہیں ۔ یعنی یہ باب ضرب سے فعل مضارع کا پہلا صیغہ (واحد مذکر غائب) ہے ۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ کی بحث الفاتحہ : ۶ یعنی ۱: ۵: ۱ (۱) میں ہو چکی ہے ۔ نیز دیکھئے ۲: ۱: ۱ (۶) ۔

[وَمَا يُضِلُّ بِهٖ] اس عبارت میں "وَ" عاطفہ (بمعنی اور) اور "مَا" نافیہ (بمعنی نہیں) ہے۔ "یضل بہ" پر ابھی اوپر بات ہوئی ہے۔ اس طرح اس "ومایضل بہ" کا ترجمہ ہے: وہ نہیں گمراہ کرتا، وہ غلط راستے پر نہیں ڈالتا اس کے ساتھ، اس کے ذریعے، اس کی وجہ سے"۔

۲:۱۹:۱(۱۱) [اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ] میں "اِلَّا" حرف استثناء ہے جس کے معنی "مگر"، "سوائے" یا "صرف ..... ہی" ہوتے ہیں۔ "اِلَّا" کے معنی و استعمال پر البقرہ: ۹ یعنی ۲:۸:۱(۳) میں بات گزر چکی ہے۔

"الفاسقین" (بالاملاء معتاد) کا مادہ "ف س ق" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فاعلین" ہے یعنی یہ لفظ "فاسِقٌ" کی جمع مذکر سالم (کی منصوب صورت) ہے۔

اس مادہ (فسق) سے فعل ثلاثی مجرد "فَسَقَ یَفْسُقُ فِسْقًا وفُسُوقًا" (ابواب نصر، ضرب اور کرم) سے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں یہ صرف باب نصر سے ہی استعمال ہوا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں "کسی چیز کا دوسری چیز سے برائی اور خرابی کے ساتھ باہر نکل آنا" (مد القاموس) زیادہ تر یہ "کسی پھل (خصوصاً تازہ پکی ہوئی کھجور) کا اپنے چھلکے سے" یا کسی جانور (خصوصاً چوہے کا) اپنے سوراخ سے ـــ باہر نکلنے کے معنی دیتا ہے۔ بلکہ "چوہیا" کو عربی میں "فُوَیْسِقَۃ" (تصغیر فاسقہ) اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے سوراخ سے باہر نکل نکل کر نقصان پہنچاتی ہے ـــ

● ان بنیادی معنوں سے اس فعل میں "راہ راست سے، قانون سے، اطاعت سے باہر نکل جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور پھر اسی سے یہ فعل "اللہ کا حکم نظر انداز کرنا، نافرمانی کرنا، دائرۂ اطاعت سے نکل جانا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لفظ "فاسق" (جو زیر مطالعہ لفظ "فاسقین" کا واحد ہے) اس فعل ثلاثی مجرد سے اسم الفاعل کا صیغہ ہے جس کے معنی اوپر

© rasailojaraid.c

بیان کردہ مصدری معنوں سے سمجھے جا سکتے ہیں یعنی " نافرمان ، دائرۂ اطاعت سے خارج" وغیرہ ۔ فقہی اصطلاح میں یہ لفظ " اخلاقی لحاظ سے غیر محتاط طرزِ عمل والا" اور " شرعی حدود پھلانگ جاتے والا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ بلکہ زیرِ مطالعہ قطعہ کے اگلے حصہ (آیت ۲۷) میں " فاسقین " کی عادات و اطوار اور ان کے اخلاق و اعمال کی واضح صفات یا علامات بیان کر دی گئی ہیں ۔

● فیروز آبادی نے " قاموس " میں یہ بیان کیا ہے کہ لفظ " فاسق " اگرچہ خالص عربی لفظ ہے ۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ جاہلی کلام یا شعر میں یہ لفظ کہیں وارد نہیں ہوا ۔ (بعض دوسرے اہل لغت نے یہ قول مشہور کوفی امام لغت " ابن الاعرابی " کی طرف منسوب کیا ہے) ۔ بہرحال قرآن کریم میں یہ لفظ (مختلف صورتوں میں) چالیس کے قریب مقامات پر آیا ہے اور معنی کے لحاظ سے بھی یہ لفظ " گناہ گار " اور " بدکردار " سے لے کر مؤمن کی ضد یعنی " کافر " تک کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ یہ سب چیزیں اپنے اپنے مقام پر زیرِ بحث آئیں گی ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ یہاں " الفاسقین " کا ترجمہ " فاسقوں ، نافرمانوں ، بدکاروں ، بے حکمی کرنے والوں " سے کیا گیا ہے ۔ جب کہ بعض نے " جو حکم نہیں مانتے " سے ترجمہ کر دیا ہے جو لفظ سے ذرا ہٹ کر ہے ۔ (جاری ہے)

بقیہ: اسلامی معیشت میں سادگی کی اہمیت

نہ رہیں اور ایک خوددار اور غیرت مند قوم کی طرح دنیا میں سر اٹھا کر چل سکیں ۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے ، اور ایسا کرنا ہمارا قومی و ملی فریضہ ہے ، لیکن اس میں ہم سب کا باہمی تعاون ہی کارآمد ثابت ہو سکتا ہے ۔

یاد رکھیے اقتصادی آزادی ہی مکمل قومی آزادی کی ضامن ہوتی ہے ۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا تھا :

تجھے گُر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی !

l.com